قرآن وحدیث

کیا بنی اسرائیل مصر واپس چلے گئے تھے؟

مولانا صدر الدین اصلاحی

قرآن مجید بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

..... فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ (شعراء - ۵۹)

ہم نے انھیں (یعنی فرعون اور آل فرعون کے) باغوں سے چشموں سے، خزانوں سے اور عمدہ قیام گاہوں سے نکال باہر کیا۔ ادھر یہ ہوا، دوسری طرف بنی اسرائیل کو ہم نے ان (سب چیزوں) کا وارث (یعنی مالک) بنا دیا۔

اسی بات کا ذکر اس نے ایک اور جگہ ان الفاظ میں کیا ہے:۔

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۔ (دخان: ۲۵ - ۲۸)

وہ کتنے ہی باغ اور چشمے، کھیتیاں اور خزانے، عالی شان قیام گاہیں اور سامانِ عیش و آرام چھوڑ گئے جن میں وہ مزے کیا کرتے تھے، ادھر تو یہ ہوا دوسری طرف ہم نے ان (ساری چیزوں) کا، ایک اور قوم کو وارث بنا دیا۔

ان آیتوں سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرعون اور اس کے لشکر کی غرقابی کے بعد سرزمین مصر اپنی تمام تر دنیوی نعمتوں کے ساتھ بنی اسرائیل کو عطا کر دی گئی تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کی تبعیت میں مصر سے نکل تو گئے تھے۔ مگر بعد میں واپس آ گئے تھے، اور یہ ملک اپنی ساری بہاروں کے ساتھ ان کے زیر اقتدار آ گیا تھا۔ جب کہ تاریخ سے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ایسا ہوا ہو۔ تاریخ کا کہنا تو یہ ہے

کہ مصر سے نکل آنے کے بعد بنی اسرائیل وہاں پھر کبھی واپس نہیں گئے بلکہ ایک مدت تک سینا کے صحرا میں زندگی گذارنے کے بعد فلسطین اور شام کے علاقے میں جاکر آباد ہو گئے تھے۔ اس تاریخی حقیقت کی موجودگی میں قرآن کریم کا مذکورہ بالا بیان عام ذہنوں کو شدید الجھن میں مبتلا کر دے سکتا ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس گتھی کو اچھی طرح سلجھا دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم نے ایسی کوئی بات ہرگز نہیں کہی ہے جو تاریخ کے مذکورہ بیان سے ٹکراتی ہو۔ اس کے فرمودات سے ایسا سمجھنا اور اس کی طرف بنی اسرائیل کی مصر واپسی کا خیال منسوب کرنا یکسر ایک بے بنیاد بات ہے، اور یہ بات اسی شخص کے ذہن میں جگہ پا سکتی ہے جس کی نظر نہ انبیائی دعوتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ضابطوں پر ہو، نہ عربی زبان کے اصول و اسالیب پر۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے زیر بحث آیتوں کے الفاظ کو ذرا غور سے دیکھئے۔ ان آیتوں میں سے کسی کے اندر بھی ان چیزوں کو نام کی صراحت کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا ہے جن کا بنی اسرائیل کو 'وارث' (یعنی مالک) بنایا گیا تھا بلکہ ان کے لئے 'ہا' (اس یا ان) کی ضمیر لائی گئی ہے، جس کی وجہ سے بات پر ایک نہ ایک حد تک ابہام کا پردہ پڑ گیا ہے یعنی کہیں بھی بات یوں نہیں فرمائی گئی ہے کہ 'ہم نے بنی اسرائیل کو ان باغوں اور چشموں کا وارث بنا دیا'، بلکہ اس طرح فرمائی گئی ہے کہ "ہم نے بنی اسرائیل کو ان کا وارث بنا دیا"۔ دوسری زبانوں کا معاملہ چاہے جو کچھ بھی ہو مگر جہاں تک عربی زبان کا تعلق ہے، اس فرق سے دونوں شکلوں میں مفہوم و مدعا کے اندر بڑے فرق کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ کسی چیز کے اظہار بیان کے لئے اگر اس کا اسم ظاہر لایا جائے تب تو اس سے وہی ایک متعین چیز سمجھی جائے گی جو اس اسم ظاہر کا مسمّٰی و مفہوم ہو گی، لیکن اگر اسم ظاہر کے بجائے ضمیر کا استعمال کیا جائے تو پھر اس سے مراد 'بعینہٖ وہی' چیز بھی ہو سکے گی جس کا ذکر پہلے آیا ہو اور جو لفظاً اس ضمیر کا مرجع ہو اور اس جیسی چیز بھی مراد ہو سکے گی، اور یہ فیصلہ قرائن کریں گے کہ کس جگہ ان دونوں میں سے کون سا مفہوم مراد ہے۔

اس اصول کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ زیر بحث دونوں آیتوں میں 'ہا' کی جو ضمیر آئی ہے اور جس کا مرجع 'جنات' اور 'عیون' وغیرہ کے الفاظ ہیں، اس سے

دونوں ہی چیزیں مراد ہو سکتی ہیں: سرزمین مصر اور اس کے باغ اور چشمے وغیرہ بھی، اور سرزمین مصر اور اس کے باغوں اور چشموں جیسی زمین اور باغ اور چشمے وغیرہ بھی۔ تین باتیں ایسی ہیں جو اس امر کا تعین کر دیتی ہیں کہ ان آیتوں میں 'ہا' کی یہ ضمیر دوسرے ہی مدعا کے لئے استعمال کی گئی ہے، پہلے کے لئے نہیں:۔

(۱) سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں مصر سے ہجرت کر کے گئے تھے، اور یہ ہجرت اللہ تعالیٰ کے اس متعین ضابطے کے تحت ہوئی تھی جو انبیاء علیہم السلام اور ان کے اہل ایمان ساتھیوں کے بارے میں ہمیشہ سے جاری رہا ہے اور وہ یہ کہ جب کوئی نبی اپنی قوم پر حجت تمام کر دیتا ہے اور دعوتی سعی و جہد کا کوئی گوشہ باقی نہیں رہ جاتا، ادھر قوم کی بڑی اکثریت اس کی دعوت کو آخری حد تک ٹھکرا چکی اور عناد و سرکشی کی انتہاؤں پر جا پہنچی ہوتی ہے تو اذن الٰہی کے مطابق پیغمبر اور اس کے اہل ایمان حواری اخلاقی حیثیت سے اس بنجر زمین اور اس بانجھ قوم کو چھوڑ کر ہجرت کر جاتے ہیں۔ یہ ہجرت وقتی نہیں بلکہ دائمی ہوتی ہے، اور ہجرت کرنے والوں کے لئے جائز نہیں رہ جاتا کہ آئندہ کبھی موقع پا کر اس مقام پر واپس آجائیں اور واپس آکر وہاں پھر سے آباد ہو جائیں۔ کیونکہ حق کے لئے جو چیز چھوڑ دی جاتی ہے وہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دی جاتی ہے۔ یہ ہجرت اللہ کی راہ میں اور اس کے دین کی خاطر دی ہوئی ایک قربانی ہوتی ہے، اور قربانی لوٹ لینے کی چیز نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کا یہی ضابطہ اور دین و ایمان کا یہی مطالبہ تھا جس کی بنا پر نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین مکہ کے لئے اس بات کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ مکہ واپس آکر وہاں از سر نو بس جائیں، حالانکہ آٹھ برس کے اندر ہی اندر مکہ فتح ہو کر اسلامی قلمرو کا جزو بھی بن گیا تھا، اور وہاں سے کفر و شرک اور اسلام دشمنی کے سارے امکانات ہمیشہ کے لئے معدوم ہو چکے تھے اس لئے کسی بھی مسلمان کے لئے وہاں جا کر آباد ہو جانے میں کوئی ظاہری رکاوٹ باقی نہیں رہ گئی تھی۔

حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل، نیز حضرت موسیٰ کی دعوت پر ایمان لا چکنے والے قبطیوں نے جو مصر کو چھوڑا تھا تو ان کا یہ چھوڑنا بھی ٹھیک اسی نوعیت کا تھا جس نوعیت کا دوسرے انبیاء اور ان کے اہل ایمان ساتھیوں کا ہوا کرتا تھا۔ ان کا یہ مصر کو چھوڑنا بھی

اسی وقت ہوا تھا جب حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ فرعون اور قوم فرعون پر اتمام حجت کر چکے تھے اور فرعون و آل فرعون کا انکار وجود اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اس لئے ان کا یہ مصر سے نکل جانا محض نقل مکانی نہیں تھا، بلکہ اللہ کی راہ میں ہجرت تھا۔ اور جب ان کا مصر سے یہ نکل جانا ہجرت تھا تو ضابطۂ الٰہی کے تحت ان کے مصر لوٹ آنے اور وہاں پھر سے آباد ہو جانے کا کوئی سوال بھی باقی نہیں رہ گیا تھا۔

(۲) دوسری بات یہ کہ تاریخی طور پر بنی اسرائیل کی مصر واپسی کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ ثبوت اگر موجود ہے تو صرف اس امر کا موجود ہے کہ مصر سے نکلنے کے بعد اسرائیلی قوم پھر کبھی وہاں لوٹ کر نہیں گئی۔ یہی بات عام تاریخ بھی کہتی ہے، اسی کی وضاحت بائبل سے بھی ہوتی ہے۔ اور یہی تصور قرآن بھی دیتا ہے۔ چنانچہ وہ جب بھی کسی ایسے واقعہ کا تذکرہ کرتا ہے جس کا تعلق بنی اسرائیل کی بعد از ہجرت تاریخ سے ہو تو اس بات کے کھلے یا ڈھکے اظہار کے ساتھ کرتا ہے کہ یہ واقعہ مصر سے باہر (مثلاً سینا کے صحرا میں یا فلسطین میں) پیش آیا تھا (مثال کے طور پر دیکھئے سورہ بقرہ کی آیات ۵۱ تا ۷۶، سورہ مائدہ آیات ۲۰ تا ۲۶ اور سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۴ تا ۷ وغیرہ)

(۳) تیسری بات یہ کہ قرآن مجید جب بنی اسرائیل کو وراثت میں دی جانے والی سرزمین کا تذکرہ ضمیر کی بجائے اسم ظاہر سے کرتا ہے تو اس وقت وہ مصر کا نہیں بلکہ شام اور فلسطین کے علاقے کا نام لیتا ہے۔ (اگرچہ یہ نام صفاتی ہوتا ہے ظاہر اور صریح نہیں ہوتا) چنانچہ سورہ اعراف میں وہ کہتا ہے کہ:۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا۔ (آیت ۱۲۷)

اور ہم نے اس قوم (بنی اسرائیل) کو جسے بے دست و پا سمجھا جا رہا تھا، اس سرزمین کا وارث بنا دیا جس کے سارے مشرق و مغرب میں ہم نے بے پایاں برکتیں رکھی ہیں۔

اس آیت میں جس خطۂ ارض کو بنی اسرائیل کی وراثت میں دیئے جانے کا ذکر ہے، اگرچہ اس کا صراحت سے نام نہیں لیا گیا ہے، مگر یہ صفت قرآن میں جس جگہ بھی

بیان کی گئی ہے ہر جگہ سرزمینِ فلسطین و شام ہی کے لئے بیان کی گئی ہے ۔ (ملاحظہ ہو سورہ بنی اسرائیل۔ آیت ۱ سورہ انبیاء آیت ۷۱ اور آیت ۸۱ ۔ سورہ سبا آیت ۱۸) اس لئے یہاں بھی اس سرزمین سے مراد فلسطین اور شام ہی کا علاقہ ہو سکتا ہے، کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح قرآن کریم بتاتا ہے کہ مصر سے بنی اسرائیل کے نکلنے کے بعد ان کو جس ملک کے عطا کئے جانے کا وعدہ فرمایا گیا تھا اور جس کی بابت ان سے کہا گیا تھا کہ "اللہ تعالیٰ نے یہ مقدس و بابرکت سرزمین تمہیں دیئے جانے کا فیصلہ کر دیا ہے" ۔ (۔۔۔۔ الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ کَتَبَ اللّٰهُ لَکُمْ ۔ مائدہ ۲۱-۵) وہ فلسطین اور اس کے اطراف کا ہی علاقہ تھا۔ نہ کہ مصر کا۔

یہ تینوں باتیں اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ مصر سے ہجرت کر جانے کے بعد بنی اسرائیل مصر واپس نہیں گئے ۔ اور جب امر واقعی یہ ہے تو ضروری ہو جاتا ہے کہ "کَذٰلِكَ اَوْرَثْنٰهَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ" کے فقرے میں "ہا" کی جو ضمیر ہے اس کا پہلا نہیں بلکہ دوسرا ہی مفہوم و مدعا سمجھا جائے، اور اس سے مراد ملک مصر اور اس کے باغ اور چشمے نہ لئے جائیں، بلکہ ملک مصر جیسا کوئی اور ملک، اور مصر کے باغوں اور چشموں جیسے کچھ دوسرے ہی باغ اور چشمے سمجھے جائیں۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن کریم کوئی ایسی بات کہہ جانے کا روادار ہو جو ضوابطِ خداوندی کے بھی خلاف پڑتی ہو اور جس سے تاریخی حقائق بھی اتفاق نہ کرتے ہوں حتیٰ کہ وہ خود اس کے اپنے دوسرے بیانوں سے بھی ٹکراتی ہو۔

آخر میں اس امر واقعی پر دلائل اور شواہد کی روشنی ڈال دینا بھی مناسب ہوگا جو عربی زبان میں ضمیروں کے بارے میں اوپر بیان کیا گیا ہے، تاکہ جو لوگ عربی سے گہری واقفیت نہیں رکھتے انھیں اطمینان ہو جائے کہ یہ کوئی خواہ مخواہ کا دعویٰ نہیں ہے۔ بلکہ فی الواقع بات یوں ہی ہے۔

عربی ادب کے مستند ترین اور مشہور ترین مجموعے "سبعہ معلقہ" کا شعر ہے:۔

یقتن جیادنا ویقلن لستم   بعولتنا اذا لم تمنعونا

(ہماری بیویاں ہمارے اصیل گھوڑوں کو کھلاتی پلاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اگر آپ لوگوں نے دشمنوں سے ہماری حفاظت نہ کی تو آپ ہمارے شوہر نہیں)

ورثناهن عن اٰباء صدق   ونورثها اذا متنا بنینا

(ہم نے انھیں اپنے باپ دادا سے وراثت میں پایا ہے، اور جب ہم مریں گے تو اپنے بیٹوں کو ان کا وارث بنا جائیں گے)
ظاہر ہے کہ جن عورتوں کی تعریف شاعر اپنے ان شعروں میں کر رہا ہے وہ اس کی اپنی اور اس کے ہم قبیلہ موجود الوقت مردوں کی بیویاں تھیں۔ ان کے باپ دادا کی بیویاں نہیں رہی تھیں نہ ہی ان کے بیٹوں کی بیویاں بننے والی تھیں۔ ان کے باپ دادا کی بیویاں کچھ دوسری ہی عورتیں تھیں، اسی طرح ان کے بیٹوں کی ہونے والی بیویاں بھی کچھ اور ہی عورتیں تھیں۔ اس کے باوجود اگر شاعر یہ کہتا ہے کہ ہم نے انھیں اپنے باپ دادا سے وراثت میں پایا ہے اور اپنے مرنے کے بعد اپنے بیٹوں کو ان کا وارث بنا جائیں گے، تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ جن اعلیٰ صفات کی ہماری یہ بیویاں ہیں ویسی ہی صفات رکھنے والی بیویاں ہمارے آباؤ اجداد کی بھی رہی ہیں اور ایسی ہی صفات کی بیویاں ہمارے بیٹوں کی بھی ہوں گی۔ معلوم ہوا کہ اس شعر میں هُنَّ (انھیں) اور هَا (ان) کی جو ضمیریں ہیں ان کا مرجع اور ان سے مراد بعینہ وہی عورتیں نہیں ہیں جن کا اوپر سے ذکر چلا آ رہا ہے۔ بلکہ 'ان جیسی' اور 'ان کی جیسی صفات رکھنے والی' عورتیں ہیں۔ اس مثال سے یہ حقیقت پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ کلام عرب میں ضمیریں جس طرح بعینہ انہی چیزوں کے لئے استعمال کی جاتی ہیں، اور بعینہ وہی ان کا مرجع ہوتی ہیں جن کا اوپر تذکرہ موجود ہوتا ہے اسی طرح 'ان جیسی' چیزوں کے لئے بھی استعمال ہوتی ہیں، اور ان سے مراد 'ان کے مشابہ' چیزیں بھی ہو سکتی ہیں۔

کلام عرب کے بعد قرآن کریم کی بھی ایک مثال دیکھ لیجئے۔ سورہ مائدہ میں فرمایا گیا ہے کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ...... قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ۔ (آیت ۔ ۱۰۲)	اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں سوالات نہ کرو جن کے متعلق اگر بتا دیا جائے تو تمہاری ناگواری کا سبب بن جائیں ...... ایسی ہی چیزوں کے بارے میں تم سے پہلے ایک قوم نے سوالات کئے تھے، پھر وہ ان کے جوابات کا (عملاً) کفر کر بیٹھی۔

اس آیت میں مسلمانوں کو مسائل میں کھود کرید کرنے اور غیر ضروری باتیں پوچھنے سے منع فرماتے ہوئے انھیں متنبہ کیا گیا ہے کہ اس طرح کے سوالات کے نتیجے میں تم پر

اللہ تعالیٰ کی طرف سے خواہ مخواہ کی بندشیں عائد ہو جائیں گی، اور اس طرح تمہاری زندگی تنگیوں میں جا گھرے گی جس کے بعد اندیشہ ہے کہ آگے چل کر کہیں تم ان بندشوں اور تنگی میں مبتلا کر دینے والے حکموں کا لحاظ رکھنے سے قاصر نہ رہ جاؤ اور ان کی پابندی نہ کر سکنے کے نتیجے میں ان کی حد تک کا فرانہ طرز عمل نہ اختیار کر بیٹھو، جس کا تجربہ تم سے پہلے کی ایک قوم، قوم یہود، کے طرز عمل سے ہو چکا ہے۔ اس قوم نے اپنے پیغمبر سے ایسے ہی غیر ضروری سوالات کئے تھے اور ایسی ہی چیزوں کے بارے میں کرید کرید کر احکام پوچھے تھے لیکن پھر ان احکام کی پیدا کی ہوئی تنگیوں سے گھبرا اٹھی تھی، اور ان کی پابندی کا حق ادا کرنے میں ناکام ہو کر ان کی حد تک عملاً کفر کی مرتکب ہو رہی۔

واضح بات ہے کہ بنی اسرائیل نے جو سوالات کئے تھے اور جن چیزوں کے بارے میں کرید کرید کر احکام پوچھے تھے وہ بعینہٖ وہی سوالات نہیں تھے اور انھوں نے بعینہٖ انہی چیزوں کے بارے میں کرید کرید کر احکام نہیں پوچھے تھے جن کے بارے میں صحابہ کرام نے احکام پوچھے تھے یا پوچھنے کا رجحان رکھتے تھے۔ اس کے باوجود آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان سوالوں اور ان چیزوں کے بیان کرنے کے لئے قرآن کریم نے قَدْ سَاَلَهَا کے الفاظ فرمائے ہیں۔ یعنی 'ھا' کی وہ ضمیر استعمال کی ہے جس کا مرجع وہی 'اَشْیَاءَ' کا لفظ ہے جو صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ عنہم کے سوالات کرنے کے سلسلے میں پہلے آچکا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں 'ھا' کی ضمیر سے مراد بعینہٖ وہی اشیاء نہیں ہیں بلکہ ان جیسی اشیاء ہیں۔

ضمیروں کے متعلق عربی زبان کے اس اصول کے جان اور سمجھ لینے کے بعد زیر بحث مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے، اور صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ "وَاَوْرَثْنَاهَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ" کے الفاظ فرما کر قرآن عزیز یہ نہیں کہنا چاہتا کہ فرعون اور اس کی فوج کی غرقابی کے بعد مصر کا ملک اور اس کے باغ اور چشمے وغیرہ بنی اسرائیل کی وراثت اور ملکیت میں دے دیئے گئے تھے، بلکہ فی الواقع یہ کہنا چاہتا ہے کہ انھیں اسی طرح کا ملک اور اسی طرح کے باغ اور چشمے، کھیت اور خزانے، عالی شان قیام گاہیں اور دوسرے

سامانِ عیش وآرام عطا کر دیئے گئے تھے۔ اور یہ پر بہار ملک فلسطین اور شام کا ملک اور یہ سامانِ عیش وآرام شام اور فلسطین کی برکتوں بھری سرزمین کا سامان تھا، نہ کہ مصر کا ملک اور اسی کے اندر پائے جانے والا سامانِ عیش وآرام۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مصر سے ہجرت کر جانے کے بعد بنی اسرائیل وہاں واپس نہیں گئے تھے۔ قرآن کریم ایسی کوئی بات ہرگز نہیں فرماتا۔ ضابطہ الٰہی اور عربی زبان وادب دونوں سے نابلد ہونے کا یا ان کو سامنے نہ رکھنے کا ثبوت دیتا ہے وہ شخص جو اس کی طرف اس بے بنیاد خیال کو منسوب کرتا ہے۔

صدر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی

مولانا صدرالدین اصلاحی
کے بعض اہم تصانیف

اسلام اور اجتماعیت

اسلام میں اجتماعیت کی کیا اہمیت ہے؟ ملی انتشار کے کیا نقصانات ہیں؟ نظم اجتماعیت کے بغیر دینی زندگی کس طرح ادھوری رہ جاتی ہے اور مطلوبہ اجتماعیت کس طرح وجود میں آتی ہے؟ یہی ہیں وہ اہم موضوعات جن سے اس عالمانہ کتاب میں بحث کی گئی ہے۔ —— قیمت ۵ روپے

قرآن مجید کا تعارف

اس کتاب میں مولانا محترم نے قرآن مجید کے نزول اس کی تدوین، اس کے کتاب الٰہی ہونے کے دلائل اور اس کی اہم اصطلاحات پر علمی انداز میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۳ روپے

حقیقت نفاق

قرآن مجید نے شرک اور کفر کے ساتھ نفاق سے بھی بحث کی ہے۔ پہلے دونوں موضوعات پر متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن نفاق کے موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ مولانا محترم کی یہ کتاب اسی کمی کو پورا کرتی ہے
قیمت 25-4

ملنے کا پتہ

مرکزی مکتبہ اسلامی۔ دھلی ۶